R. N. 2186/57.

Regd. No. A 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29

Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپیہ
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
۲۲-۱۰-۶۱

جلد ۲۰ - شمارہ ۳۹	ایڈیٹر - آل احمد سرور	علی گڑھ - ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۱ء

حکم چند نیّر

"قولِ فیصل"

ہماری زبان کے صفحات میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاؔد یمین السلطنت کی ذاتِ والا صفات "گرمیِ گفتار" کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اس "گرمیِ گفتار" کا سہرا تو مولوی عبدالماجد صاحب دریاآبادی کے سر ہے لیکن ڈاکٹر محمد حسن صاحب اور پریم پال اشک صاحب کی کوششیں بھی کچھ کم داد کی مستحق نہیں ہیں۔ مہاراجہ موصوف کے حالات و کمالات سے راقم کو بھی کچھ دلچسپی رہی ہے۔ اس ضمن میں کچھ عرض کرنے سے پیشتر مہاراجہ صاحب کی حیات اور تصنیفات کا ذکر ضروری ہے اور بے محل بھی نہ ہوگا۔

مہاراجہ شاؔد کی ولادت سنہ ۱۸۶۴ء (۱۲۸۰ھ) میں حیدرآباد میں ہوئی۔ اپنے نانا مہاراجہ نریندر پرشاد بہادر کی نگرانی میں پرورش پاتے رہے۔ رواج زمانہ کے مطابق عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی پڑھتے رہے اور چاروں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ خوشنویسی کا فن بھی سیکھا اور کامل الفن خوشنویس ہوئے۔ اُردو شاعری میں داؔغ سے تلمذ تھا تو فارسی شاعری کی اصلاح مرزا علی بابا شیرازی سے لیتے تھے۔ آپ کے گرد و پیش ہمیشہ شعرا کا جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ جن میں ظہیر دہلوی، سرشار لکھنوی، جلیل، اختر، فانی بدایونی اور جوش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مہاراجہ نے سنہ ۱۹۴۰ء (۱۳۵۹ھ) میں ۷۷ سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ موصوف کو اُردو و فارسی نظم و نثر میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ تصانیف کی تعداد (۶۷) ہے جن میں ناول، افسانے، نظموں کے مجموعے اور سفرنامے وغیرہ سب شامل ہیں۔ منظوم و منثور تصانیف کی فہرست بلحاظ موضوع سنہ تصنیف و طبع داستانِ ادب حیدرآباد ص ۱۶۴-۶۵ مولفہ ڈاکٹر زورؔ کے حوالے سے درج ذیل ہے، جس سے مہاراجہ کے تبحرِ علمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نظم (اُردو، فارسی)۔ باغِ شاد سنہ ۱۳۰۱ھ، ارمغانِ زیبا سنہ ۱۳۱۲ھ، تحسینِ تاریخ سنہ ۱۳۱۵ھ، نسیمِ سحر سنہ ۱۳۱۲ھ، نذرِ شاد سنہ ۱۳۱۶ھ، صبحِ امید سنہ ۱۳۲۴ھ، مثنوی حسن و عشق سنہ ۱۳۲۴ھ، نغزِ شاد سنہ ۱۳۲۵ھ، خلدہ شاد سنہ ۱۳۱۵ھ، ترانۂ شاد سنہ ۱۳۲۵ھ، شگوفۂ بہار سنہ ۱۳۲۶ھ، رباعیاتِ شاد حصہ اول سنہ ۱۳۳۳ھ، آشوبِ عظیم سنہ ۱۳۳۶ھ، نعرۂ مستانہ سنہ ۱۳۳۳ھ، بیاضِ شاد سنہ ۱۳۳۲ ہجری، رین بسیرا سنہ ۱۳۴۴ھ، نظم دو بیہ ۱۳۴۴ھ، رباعیاتِ شاد حصہ دوم ۱۳۴۴ھ، پریم درپن سنہ ۱۳۴۵ھ، بزمِ شاد ۱۳۴۹ھ، رباعیاتِ شاد حصہ سوم ۱۳۵۰ھ۔

نثر (الف) ناول اور افسانے۔ مطلعِ خورشید ۱۳۱۵ھ، چنچل نار ۱۳۲۱ھ، بزمِ خیال سنہ ۱۳۲۲ھ، فسانۂ شیدا سنہ ۱۳۳۴ھ۔

(ب) سفرنامے و روزنامچے۔ قدومِ سلطانی سنہ ۱۳۱۶ھ، سفرِ دو ہفتہ سنہ ۱۳۲۰ھ، اروندِ شریف ۱۳۲۲ھ، جذباتِ شاد سنہ ۱۳۲۹ھ، سیرِ ناگپور سنہ ۱۳۳۱ھ، سیر و سفر سنہ ۱۳۳۶ھ، جامِ جہاں نما سنہ ۱۳۳۹ھ، سفرِ شاد و نگر سنہ ۱۳۳۱ھ، روزنامچہ گلبرگہ سنہ ۱۳۳۱ھ، سیرِ پنجاب ۱۳۴۳ھ، تفریحِ شاد ۱۳۴۳ھ۔

(ج) خطوط، تقاریر اور تاثرات۔ رقعاتِ شاد سنہ ۱۳۱۶ھ، اسپیچ ۱۳۲۲، فریادِ شاد، فراقِ آصف پرشاد۔

(د) علمی کتابیں۔ لطائفِ بےنظیر سنہ ۱۳۰۲ ہجری، ارمغانِ رمل سنہ ۱۳۰۷ھ، مطلعِ جگت سنہ ۱۳۲۳ھ، آزادی سنہ ۱۳۲۳ھ، ارمغانِ وزارت یعنی مجموعہ مضامین سنہ ۱۳۲۳ھ، مخزن القوافی سنہ ۱۳۲۳ھ، نورِ چشم ۱۳۳۸ھ، قومی لیڈر سنہ ۱۳۳۹ھ

(ہ) مذہبی رسائل۔ دسہرہ، کرشن کلا، گیان درپن، ایمانِ شاد، دولہا حسین سنہ ۱۳۳۶ ہجری،

بزم حسین منظوم ۱۳۳۶ھ، مثنوی آئینۂ وحدت ۱۳۳۲ھ، مثنوی آئینۂ وجود ۱۳۳۳ ہجری، مثنوی بحر وجود ۱۳۴۳ھ، قربانی ۱۳۵۲ھ۔

ان مستقل کتابوں کے علاوہ کئی علمی و ادبی جریدوں کی ترتیب تدوین بھی کرتے رہے۔ دبدبۂ آصفی شوکت عثمانی اور محبوب الکلام اپنے زمانوں میں موقر جریدوں میں شمار ہوتے تھے۔ مہاراجہ صاحب کی وفات پر کچھ اصحاب نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا، نذر ناظرین ہے:

علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم فرماتے ہیں:-

مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اس کی رائے روشن سے نگاہ روزگار
اُس کی تقریروں سے رنگیں گلستان شاعری
اُس کی تحریروں پہ نظم مملکت کا انحصار
لیلیٔ معنی کا محمل اُس کی نثر دلپذیر
نظم اُس کی شاہد راز ازل کی پردہ دار

مولانا مسعود علی محوی صاحب کہتے ہیں:-

سخن را سرپرست و قدرداں بود • نگاہ نکتہ بیں فکر رسا داشت
فدائے علم و شیدائے ہنر بود • مذاق شعر از عہد صبا داشت

مولانا منظور الحسن صاحب ماہر القادری رقمطراز ہیں:-

وہ ترا علم و ادب سے ذوق و شوق
وہ ترا حسن طبیعت یاد ہے

یہ ہے ایک مختصر سی روداد مہاراجہ شاد کے تصنیفی و تالیفی کام کی جس کا زمانہ ۱۳۰۳ھ سے شروع ہو کر ۱۳۵۵ھ پر ختم ہوتا ہے۔ نیز معتقد ادیبوں کی آراء کا خلاصہ بھی پیش ہے اس پر بھی اگر کوئی مہاراجہ شاد کے تبحر علمی کا اعتراف نہ کرے اور اُن پر ادبی خیانت کا بہتان تراشے تو سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

راقم الحروف نے اپنے مضمون مطبوعہ ہماری زبان مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۰ء میں قمر رئیس صاحب اور اشک صاحب کے شکوک کا ازالہ دلائل و براہین سے کر دیا تھا اور جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی نے بھی دکن ریویو اور دیگر شواہد سے میرے خیال کی تائید فرمائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہر دو اصحاب کے شکوک رفع نہیں ہوئے۔

اشک صاحب ۲۲ر جنوری ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:-

"ہمارے ہاں تحقیق اور تنقید صرف اس لئے بدنام ہے کہ ہم لوگ حقائق کی روشنی میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس کمزور دلائل کا سہارا لے کر خارجی شواہد پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھتے ہیں اسی کا سہارا جناب حکم چند نیر نے لیا ہے۔"

اس بارے میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ نصیر الدین صاحب ہاشمی کے محولہ بالا مضمون سے اشک صاحب کو واضح ہو گیا ہوگا کہ "حقائق کی روشنی میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش میں نے نہیں کی" یا جناب اشک نے۔ نیز کمزور دلائل کا سہارا لے کر خارجی شواہد پر اپنی تنقید کی بنیاد کس نے رکھی؟

اسی مضمون میں جناب اشک اپنے مضبوط دلائل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "چنچل نار کا سرورق دیکھ کر معلوم ہوا کہ اس کا سنہ اشاعت ۱۳۲۱ھ یعنی ۱۹۰۳ء ہے جبکہ حضرت شاد بھی ۱۹۰۳ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔ اگر یہ تصنیف حضرت شاد کی ہوتی تو یقیناً سرشار کی وفات کے قبل شائع ہوتی اور حضرت سرشار اپنے اس شاگرد پر فخر کرتے۔ لیکن جو تو یہ ہے کہ یہ ناول شاد کی تخلیق نہیں تو ان کی "کوششوں" کا نتیجہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔"

اس پیراگراف کا تجزیہ کرنے پر حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:-

(ا) چنچل نار کا سنہ اشاعت ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء ہے۔

(ب) مہاراجہ شاد کا سال وفات بھی ۱۹۰۳ء ہے۔

(ج) اگر یہ تصنیف حضرت شاد کی ہوتی تو یقیناً حضرت سرشار کی وفات کے قبل شائع ہوتی اور حضرت سرشار اپنے اس شاگرد پر فخر کرتے۔

(د) لیکن حق تو یہ ہے کہ یہ ناول حضرت شاد کی تخلیق نہیں تو اُن کی "کوششوں" کا نتیجہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسے وحی و الہام سمجھا جائے تو بات اور ہے ورنہ تاریخی شواہد تو کچھ اور کہتے ہیں۔ (ا) تقویم کی رو سے ۱۳۲۱ھ کے مطابق ۱۹۰۳/۱۹۰۴ء سال پڑتے ہیں نہ کہ ۱۹۰۳ء۔ اور شاید حضرت اشک نے چنچل نار کا سرورق دیکھا ہی نہیں۔ دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ سال اشاعت ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۲ء درج ہے۔ (ب) مہاراجہ شاد کا سال وفات تو ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء ہے نہ کہ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء۔ (ج) چنچل نار کا سن اشاعت ۱۹۰۲ء ہے اور سرشار کا سال وفات ۱۹۰۳ء۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ناول سرشار کی حیات میں شائع ہو چکا تھا۔ ہاں یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حضرت سرشار اپنے اس شاگرد پر فخر کرتے تھے یا نہیں۔ اشک صاحب کی یہ منطق سمجھ میں نہ آئی کہ کیا شاگردوں کی تصانیف کا استادوں کی حیات میں شائع ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اگر کوئی شاگرد اپنی تصنیف کو استاد کے راہی ملک عدم ہونے کے بعد شائع کراتا ہے تو سمجھ لیا جائے کہ یہ تصنیف حضرت استاد کی تھی۔ بددیانتی سے شاگرد اپنے نام سے منسوب کر رہا ہے۔ (د) یہ آخری فقرہ تو اب تک بھی راقم کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اشک صاحب سے استدعا ہے کہ اس کی وضاحت فرما کر بندہ کو ممنون احسان فرمائیں گے۔ بالخصوص لفظ کوششوں کو واوین میں مقید کرنے کا مطلب بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔

(باقی صفحہ ۸ پر)

۱۰؎ ۵ر فروری ۱۹۶۱ء کے "ہماری زبان" میں اشک صاحب اس کی تصحیح شائع کر چکے ہیں۔ (ادارہ)

اداریہ

اُردو صحافت آزادی کے بعد

۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے دگیان بھون میں اُردو کے اخباروں کی ایک نمائش کا افتتاح کیا۔ یہ نمائش نشر و اشاعت کی وزارت کی طرف سے کی گئی تھی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس سے آزادی کے بعد اُردو صحافت کی ترقی کا پورا پورا ثبوت مل گیا۔ آزادی سے پہلے جتنے اخبار اُردو میں نکلتے تھے، اب اس کے دُگنے نکلتے ہیں۔ اُردو صحافت کا آغاز ۱۸۲۲ء سے ہوتا ہے اور اُنیسویں اور بیسویں صدی کی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق نہایت کارآمد اور مفید معلومات ہمیں ان اخباروں سے مل جاتی ہیں۔ پنڈت جی نے اپنی تقریر میں اُردو کو ہماری مشترک تہذیب کا استارہ بتایا اور اُردو اخباروں کی ترقی پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ اُنھوں نے اُردو کی قومی حیثیت پر زور دیا اور یہ امید ظاہر کی کہ دوسری قومی زبانیں اُردو سے اثر قبول کریں گی اور اس پر اثر بھی کریں گی۔ پنڈت جی نے اخبار نویسوں سے یہ بھی اپیل کی کہ وہ اخبار کی زبان کو کتابی اور مشکل نہ بنائیں اور اس سلسلے میں مغرب کے اخباروں کی زبان کا حوالہ بھی دیا۔ ہمارے خیال میں اردو صحافت کی زبان پہلے سے زیادہ عام فہم ہو گئی ہے مگر ابھی یہ کوشش اور جوش و خروش سے ہونی چاہیے تاکہ اخباروں کی اشاعت بھی بڑھے اور وہ عوام کے سچے ترجمان بھی کہلا سکیں۔

پنڈت جی نے اُردو کے اخبار نویسوں کو بہت سے مفید مشورے بھی دئے ہیں جن پر عمل کرکے وہ اخبار نویسی کے ذریعہ سے ملک و قوم کی اچھی خدمت کرسکتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اب اخبار نویسوں کو سنجیدگی کے ساتھ یہ کوشش کرنا چاہیے کہ وہ اس دور کی ضروریات کو پورا کریں۔ کاغذ، کتابت، طباعت کو بہتر بنائیں، تصویروں کا انتظام کریں، ہوسکے تو ٹائپ میں اخبار نکالیں، تاکہ جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ اخبار چھپ سکیں۔ اُن میں صرف پورے صفحے کی سرخیاں نہ ہوں اور سنسنی خیز خبروں کی بھرمار نہ ہو، بلکہ حالاتِ حاضرہ پر مفید کالم، مختلف مذاق کے لوگوں کے لئے مختلف فیچر، اور خبروں میں تنوع کا بھی التزام کیا جائے۔ اُردو کے اخباروں کی اشاعت کم ہونے کا صرف یہ سبب نہیں کہ اخبار خریدنے والے کم ہیں، یا اُردو والے بے حس ہیں، بلکہ بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اچھے اخبار تنوع اور افادیت میں انگریزی کے اخباروں کی برابری نہیں کرسکتے۔ ان اخباروں کی مالی حیثیت بھی زیادہ مستحکم نہیں۔ ضرورت ہے کہ تازہ ترین خبروں کے چھپنے کا مناسب انتظام ہو، خاص خاص مقامات پر نامہ نگار ہوں، تصاویر دی جاسکیں۔ ان چیزوں کے لئے وسائل کی ضرورت ہے، مگر ہمت اور کوشش سے وسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔ وسائل کے انتظار میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

اُردو کے اخباروں کو اپنے قومی فریضہ کا ہر قدم پر لحاظ رکھنا ہے۔ ہر قومی زبان کے لئے ترقی کے مواقع ہیں۔ اُردو کے لئے بھی ہیں۔ ایسے صوبوں میں بھی جہاں حکومتوں نے اُردو کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا ہے، اُردو کے اخبار بڑی تعداد میں شایع ہوتے ہیں۔ پنجاب کا ریکارڈ اس لحاظ سے نہایت شاندار ہے۔ ہمیں امید ہے کہ پنجاب اپنے اس ریکارڈ کو قائم رکھے گا اور دوسری ریاستوں میں بھی اُردو کے اخباروں کی اشاعت بڑھے گی۔ اس لحاظ سے اتر پردیش ابھی پیچھے ہے۔ یہاں سے کئی اہم اخبار نکلتے ہیں، مگر ان کی اشاعت بہت زیادہ نہیں۔ اتر پردیش کو اپنی روایتی سُست رفتاری چھوڑ کر تیزی سے میدانِ عمل میں آنا ہے۔

اِدھر اُدھر سے

لندن میں ٹیگور کا کتبہ

ایک اطلاع کے مطابق رابندر ناتھ ٹیگور کی یاد میں ایک کتبے کی نقاب کشائی ۱۹ر اکتوبر کو لندن کے اس مکان میں کی گئی جہاں ۱۹۱۲ء میں ٹیگور نے قیام کیا تھا۔ یہ مکان ہیمپسٹیڈ میں واقع ہے۔ ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے صدر نے نقاب کشائی کے فرائض انجام دیے۔ کتبہ میں "لندن کنٹری کونسل رابندر ناتھ ٹیگور ۱۸۶۱ء سے ۱۹۴۱ء ہندوستانی شاعر یہاں ۱۹۱۲ء میں قیام پذیر تھے" کندہ ہے۔

اتحاد کیلئے ہندوستان کی امنگ ڈرامہ نگار کے لئے انعام

مرکزی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں "اتحاد کے لئے ہندوستان کی امنگ" کے موضوع پر بہترین ڈرامہ لکھنے والے کو انعام دیا جائیگا۔ یہ اعلان مرکزی وزیر برائے سائنسی ریسرچ و ثقافتی امور مسٹر ہمایوں کبیر نے کیا ہے۔

ہندوستانی صحافت کے متعلق معلومات

ہسلاپ کالج ناگپور کے شعبۂ صحافت کے طلبہ کی طرف سے ایک تحقیقی منصوبہ شروع کیا گیا ہے جو اس ملک میں اپنی قسم کا ایک منفرد منصوبہ ہے۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی صحافت کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی ایک بالتفصیل روداد مرتب کی جائے

اور اسے چھاپا جائے۔ تحقیق کا تعلق متعلقہ مضامین سے بھی ہوگا۔ مثال کے طور پر سماجی تعلیم، ریڈیو، ٹیلی وژن اور اشتہارات وغیرہ اب تک دو سو کتابوں کی فہرست تیار کی گئی ہے۔

تلگو بولنے والوں کے لئے اُردو کی تعلیم

تلگو زبان والے ایسے تعلیم یافتہ اشخاص کو جو اردو زبان سے بھی معمولی واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں انجمن ترقی اردو حیدرآباد کے زیر اہتمام اُردو سکھانے کا انتظام کیا جارہا ہے۔ اس غرض کے لئے اردو ہال، حمایت نگر میں ایک کلاس کھولی جائے گی۔ وقت شام کے ۶ بجے سے ۸ بجے تک رہے گا۔ طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جائے گی۔

برنارڈ شا کی ایک تصنیف کی رائلٹی

معلوم ہوا ہے کہ جارج برنارڈ شا کو ان کے ایک ناول کی بنیاد پر تیار کئے گئے ایک غنائیہ "مائی فیر لیڈی" کی ایک سال کی رائلٹی دو لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ ملی ہے۔ یہ غنائیہ سنہ ۱۹۵۶ء سے چل رہا ہے۔ اور اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اب تک برنارڈ شا کے وارثین کو اس سے کتنی آمدنی ہوگی۔

اس غنائیہ کا کاپی رائٹ کل چار لاکھ ۳۰ ہزار روپیہ مقرر کیا گیا تھا۔ مگر سنہ ۱۹۵۶ء سے اب تک اس سے جو رائلٹی ملی ہے وہ اس رقم سے کہیں زیادہ ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف کا اندازہ ہے کہ اس سلسلہ میں جارج برنارڈ شا کے وقف کو جو کل رقم ملی ہے وہ دس لاکھ پونڈ سے زیادہ ہے اور اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ آنے والے سالوں میں اس غنائیہ کی رائلٹی میں کچھ کمی ہوگی۔

اس کے علاوہ "ناشروں" نے جارج برنارڈ شا کی کتابوں میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینا شروع کردی ہے۔ ان کے منتخب مکتوبات تین جلدوں میں چھاپے جائیں گے اور پہلی جلد آئندہ سال بازار میں آجائے گی۔

لندن میں ٹیگور نمائش

وزیراعظم برطانیہ مسٹر ہیرلڈ میکملن کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اگلے ماہ انڈیا ہاؤس میں منعقد کی جانے والی ٹیگور نمائش کی رسم افتتاح ادا کریں۔ وزیراعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو جو امریکہ جارہے ہیں اس وقت لندن میں ہوں گے لہٰذا امید ہے کہ وہ ۸ر نومبر کو نمائش کی افتتاحی تقریب میں شرکت کریں گے۔ نمائش رابندر ناتھ ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلہ میں منعقد کی جارہی ہے۔ اس سے پہلے ہندوستانی شاعر کے اعزاز میں برطانیہ بھر میں تقاریب منعقد کی گئی تھیں۔ انکی بنائی ہوئی تصویروں کے علاوہ ان کی بنگالی، انگریزی اور مختلف یورپی زبانوں کی کتابیں بھی نمائش میں پیش کی جائیں گی۔ چالیس تصویریں خاص طور سے ہندوستان سے منگوائی گئی ہیں۔ نمائش کے ایک کمرہ میں شاعر کی زندگی سے متعلق ایک فلم دکھائی جائیگی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی آواز کے ٹیپ ریکارڈ بھی بجائے جائینگے۔ نمائش دو ہفتے جاری رہے گی۔

اُردو کے اخباروں اور کتابوں کی نمائش

۱۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کو صبح ۱۱ بجے وگیان بھون دہلی میں وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو نے اُردو کے اخبارات اور کتابوں کی نمائش کا افتتاح کیا۔ یہ نمائش آزادی کے بعد سے بھارت میں اُردو ادب و صحافت کی ترقی کی ایک واضح تصویر پیش کرتی ہے۔ نمائش میں ملک کی ہر ریاست کے اُردو کے اخباروں کے پرچے اور ان کے خاص ایڈیشنوں کا ایک خصوصی انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ نمائش میں اُردو کے پبلشروں ایڈیٹروں، صحافیوں کی تصویریں اور اُردو کے کچھ پرانے اخباروں کے عکس شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف ریاستوں میں دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو پریس کی ترقی و ارتقا ظاہر کرنے والے چارٹ اور نقشے بھی دکھائے گئے ہیں۔

کتابوں کے سکشن میں ملک کے سرکردہ ناشرین کی مختلف مضامین کے بارے میں مطبوعات کے نمونوں کی نمائش کی گئی ہے نیشنل آرکائیوز سے حاصل کردہ اردو کی کچھ قدیم قلمی دستاویزیں بھی دکھائی جارہی ہیں۔ یہ نمائش وزارت اطلاعات و نشریات کی زیر سرپرستی ہو رہی ہے اور ۵ ۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء تک جاری رہے گی۔ عوام کے لئے یہ نمائش روزانہ شام کے ۵ بجے سے رات کے ۸ بجے تک کھلی رہے گی۔ اتوار ۲۲ر اکتوبر کو یہ نمائش صبح کو دس بجے سے دو پہر کے ایک بجے تک کھلی رہے گی۔

ساغر نظامی ماسکو

۱۶ر اکتوبر کو حکومت ہند کی درخواست پر ایک ثقافتی وفد ماسکو کے لئے روانہ ہوا جس میں اُردو ادب کی طرف سے مشہور شاعر ساغر نظامی اور ہندی ساہتیہ کی طرف سے شری رام دھاری سنہا دنکر (ایم پی) نے نمائندگی کی۔ روس میں یہ وفد، جس میں مشہور ادیب شاعر اور سنگیت کار شامل ہیں، تین ہفتے قیام کرے گا۔

ہندی کے مشہور شاعر نرالا کا انتقال

ہندی کے مشہور شاعر سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کا الہ آباد میں ۱۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کو انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۶۵ برس کی تھی۔ نرالا کافی مدت سے بیمار تھے۔ وہ ہندی کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے آزاد نظمیں لکھنا شروع کیں اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ انھوں نے ناول اور ادبی تنقید کی متعدد کتابیں لکھیں۔ وہ ہندی کے دو ادبی رسالوں کے ایڈیٹر بھی تھے۔

استاد بڑے غلام علی خاں کو حکومت مہاراشٹرا کا عطیہ

چیف منسٹر مہاراشٹر مسٹر چوان نے ایک کلچرل ادارے "نو پور" کے نمائندہ سے بیان کیا کہ حکومت مہاراشٹر نے ملک کے نامور موسیقار استاد بڑے غلام علی خاں کو ۵ ہزار روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔ استاد بڑے غلام علی خاں ان دنوں فالج کے حملہ سے علیل ہیں۔

ٹیگور کی شاعری

جمیل مظہری

اک روحِ عظیم لا اُبالی
تخئیل کا پیکرِ مثالی
سرگشتۂ جستجوئے مبہم
بیتابیٔ شرر و قلبِ شبنم
جویائے حقیقتِ تجلّی
صدیوں سے خلا میں مضطرب تھی
گمبھیر اتھاہ تیرگی میں
بے تاب تپیدہ روشنی میں
کوشش تھی کہ سوئے عرش جائیں
تخلیق کے راز کچھ چرائیں
جس سمت مڑی حجاب دیکھا
اک عالمِ پیچ و تاب دیکھا۔
گزری امکاں کے دائروں سے
نور و ظلمت کے گھونگھٹوں سے
رنگ نکہت کے قافلوں میں
مستی کے گلابی بادلوں میں
ڈھونڈھا کی بصد نیاز و تمکیں
اسرارِ صفا و رازِ تزئیں
تاروں کے ہجوم میں پہونچکر
گلزارِ نجوم میں پہونچکر
توڑے کچھ پھول کہکشاں سے
کلیاں چنیں گلشن جناں سے
مہتاب کی جھیل میں ڈبوکر
بہتی ہوئی چاندنی میں دھوکر
جھولی میں شعور کی چھپایا
سدرہ کا دریچہ مسکرایا
جلوے ہوئے مائلِ تکلّم
پردے کی شکن بنی تبسّم
دیکھا جو یہ لطف کا کنایا
جذبہ اسے تا بہ عرش لایا
آئی یہ صدا کہ لن ترانی
اے دزدِ جواہرِ معانی
جھولی میں جو تو نے ہیں جواہر
جا ان کو بکھیر دے زمیں پر
یہ سن کے بڑھی جو بیقراری
دل پہ ہوئی بیخودی سی طاری
قدسی تھے رکوعِ بندگی میں
خم آگیا اس کی راستی میں
مستی میں جو اس نے سر جھکایا
رحمت کو بھی اس پہ پیار آیا
پونچھا رضوان نے پسینہ
حوریں لائیں اک آبگینہ
پہنا کے لباسِ نور و نکہت
سونپی اسے خلد کی امانت
پایا جو قضا سے کچھ اشارا
بنگال میں اس کو لا اُتارا
پہونچا جو زمیں پہ یہ پجاری
مہتاب نے آرتی اُتاری
راہی نے جو کھولا اپنا توشہ
مہکا صحرا کا گوشہ گوشہ
خوشبو کی جو بھیک لی ہوا نے
دامن پھیلا دیے فضا نے
تحفہ تھا زمیں پہ آسماں کا
گھونگھٹ سے غرورِ حسن جھانکا
تھا عشق مقامِ سرخوشی میں
جو تھا گہوارۂ خودی میں
ذرّوں نے بھی اپنی آنکھ کھولی
راہی نے لٹا دی اپنی جھولی
برسیں جو وہ رس بھری گھٹائیں
دھرتی دینے لگی دعائیں
ٹیگور کی شاعری یہی ہے
کیا کہیے کہ جائے خامشی ہے
اس بھید کا کون پردہ کھولے
جادو ہے کہو کہ خود ہی بولے
گھنشیام کی لے کہاں سے آئی
داؤد کی لے کہاں سے آئی
صحراؤں کی خامشی سے پوچھو
منظر کی غنودگی سے پوچھو
بنگال کی مالنوں سے پوچھو
گوکل کی گوالنوں سے پوچھو
چھیڑا ہے یہ دیپک راگ کس نے
چھیڑی ہے سپت فضا میں آگ کس نے
کلیوں کے دیے جلائے کس نے
تاروں کے یہ کھیت اُگائے کس نے
اک روشنی چار دانگ میں ہے
افشاں سی زمیں کی مانگ میں ہے
یہ رنگ یہ راگ ہو مبارک
دھرتی کو سہاگ ہو مبارک

انجمن کا خبر نامہ

اُردو کے بہی خواہوں سے بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو کی اپیل

پٹنہ۔ ۱۰؍ اکتوبر، بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو کے دفتر سے حسب ذیل اپیل تمام اُردو کے بہی خواہوں اور ریاستی انجمن کی شاخوں کے نام برائے اشاعت بھیجی گئی ہے۔

(۱) آپ کے گاؤں یا شہر میں اُردو مکتب نہیں ہیں، یا ہیں تو وہاں اُردو تعلیم کا مناسب بندوبست نہیں ہے یا اُردو ٹیچر کا انتظام نہیں ہے یا معقول سرکاری امداد نہیں ملتی یا بند کر دی گئی ہے؟

(۲) ہائی اسکولوں میں اُردو تعلیم کا مطلق انتظام نہیں، یا پہلے تھا اب بند کر دیا گیا یا ٹیچر ہٹا دیے گئے یا اُردو طلبہ کا داخلہ نہیں ہوتا یا اُردو ٹیچر سے دوسرے مضامین پڑھانے کو کہا جاتا ہے۔

(۳) کالج میں اُردو کمپوزیشن لازمی مضمون کے پڑھانے کا بھی انتظام نہیں ہے یا پرنسپل اُردو کی پڑھائی نہیں ہوتی یا اُردو مضمون لینے والوں کا داخلہ نہیں ہوتا یا اُردو لکچرر بحال نہیں کیے گئے ہیں یا اُردو آنرز کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہے یا مزید اُردو لکچرر درکار ہیں؟

(۴) مڈل یا ہائی اسکولوں میں اُردو پڑھنے والے طلبہ کو امتحانات میں ان کی مادری زبان یعنی اُردو میں لازمی طور پر سوالات نہیں دیے جاتے ہیں؟

(۵) اُردو لائبریری نہیں ہے یا ہے تو سرکاری امداد سے محروم ہے؟

(۶) مکاتب، اسکول اور کالج کے نصاب کی اُردو کتابیں یا تو چھپی نہیں ہیں یا نایاب ہیں یا غلطیوں سے پُر ہیں یا ان میں قابلِ اعتراض باتیں موجود ہیں؟

اگر آپ اُردو کے بہی خواہ ہیں تو مذکورہ بالا سوالات اور ان کے علاوہ اُردو آبادی کی تمام شکایات سے فوراً مطلع کیجیے، واقعات بالکل صحیح ہوں اور تفصیل کے ساتھ ہوں، جملہ سوالات کے جوابات جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو، انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ ۴ کے پتے سے بلا تاخیر بھیجکر اپنی اُردو دوستی کا ثبوت پیش کریں۔ نیز تمام شاخوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اُردو تحریک کے ترجمان انجمن ترقی اُردو کے آرگن "ہماری زبان" ہفتہ وار علی گڑھ کے اگر خریدار نہیں تو جلد سے جلد اس کے خریدار بن جائیں۔

(شمس الہدیٰ ناظم نشر و اشاعت بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو پٹنہ ۴)

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔ منیجر

کل آندھرا پردیش اُردو کانفرنس کا انعقاد

حیدرآباد، ۱۱؍ اکتوبر۔ انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش نے طے کیا ہے کہ اُردو کو درپیش موجودہ مسائل کا جائزہ لینے کے لیے کل آندھرا پردیش اُردو کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ اس سلسلے میں میسرز حبیب الرحمٰن، جانکی پرشاد، عابد علی خاں، راج بہادر گوڑ، احمد علی خاں، ڈی راما نج راؤ، ڈاکٹر عبد المنان، سری نواس لاہوٹی، حسینی شاہد، پروفیسر سید محمد اور پروفیسر عبد القادر سروری نے حسب ذیل مشترکہ اپیل جاری کی ہے:- آندھرا پردیش میں اُردو دوسری علاقائی زبان تسلیم کی جا چکی ہے اس سے ایک طرف ریاست میں اُردو بولنے والوں کا آئینی موقف مستحکم ہوا اور ہندوستان بھر میں اُردو تحریک کے لیے نئی راہیں کھل گئیں، تو دوسری طرف خود ہمارے سامنے نئے مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا بہت ضروری ہے۔ ان مسائل کی نوعیت وہ نہیں ہے جن سے ہم اب تک دوچار تھے۔ اس لیے کہ آج ہمارے پیش نظر یہ مسئلہ نہیں ہے کہ اُردو کے تعلق سے حکومت کی پالیسی کیا ہے بلکہ اس مسئلے کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ حکومت نے جس پالیسی کا اعلان کیا ہے اس کو کہاں تک روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت کے اعلانات اور ان کی عمل برآری کے درمیان ایک خلیج حائل ہے اور یہ خلیج اسی وقت پاٹی جا سکتی ہے جبکہ ہم غیر ضروری نظریاتی مباحث سے ایک حد تک الگ ہو کر عمل کے میدان میں آئیں اور اس بات کی کوشش کریں کہ حکومت کے ہر اعلان کی ہر سطح پر تعمیل ہو۔

اس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی کم اہم نہیں ہے کہ خود اُردو والے اُردو کے تحفظ و ترقی کے لیے کیا کر رہے ہیں اس لیے کہ تہذیبی اور سماجی مسائل محض حکومت پر تکیہ کر کے حل نہیں کیے جا سکتے۔ یہ مسائل ایک بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تحریک کے مسائل ہیں اور ان سے ہم اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جبکہ حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ لیں۔ اپنے اداروں کو وسیع بنیادوں پر مستحکم کریں۔ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور حکومت کی معلنہ پالیسی کے نفاذ کے لیے سنجیدگی کے ساتھ جد و جہد کریں۔ اس غرض کے لیے انجمن ترقی اُردو کی شاخوں کا آندھرا پردیش کے گوشے گوشے میں قائم ہونا اور ایسے کارکنوں کا جو روزمرہ کے مسائل کو تندہی اور مستعدی کے ساتھ حل کرنے میں اپنا وقت دے سکیں تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔

یہ اور ایسے ہی دوسرے مسائل کو حل کرنے کے لیے آندھرا پردیش کے اُردو بولنے والوں کے نمائندوں کا ایک جگہ جمع ہونا اور سر جوڑ کر بیٹھنا ضروری ہے۔ اسی غرض سے انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش حیدرآباد نے فیصلہ کیا ہے کہ کل آندھرا پردیش اُردو کانفرنس منعقد کی جائے۔ ہمیں توقع ہے کہ تمام اردو دوست اس فیصلے کا خیر مقدم کریں گے۔ یقین ہے کہ یہ کانفرنس ہمیں ایک نئی طاقت اور توانائی بخشے گی اور ہم مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ (سیاست حیدرآباد)

انجمن ترقی اُردو مغربی بنگال کی مجلس عاملہ کا جلسہ

مجلس عاملہ انجمن ترقی اُردو مغربی بنگال کا ایک ہنگامی جلسہ جناب سید بدرالدجیٰ صاحب ایم۔ ایل۔ اے کی صدارت میں ۱۷ر اکتوبر کی شام کو دفتر انجمن میں منعقد ہوا جس میں مغربی بنگال اسمبلی میں پاس ہونے والے سرکاری زبان بل پر غور ہوا اور اس امر کو تشویش کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ اس بل میں اُردو کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور اسے سرکاری زبان کی حیثیت سے کسی علاقے میں کوئی مقام نہیں دیا گیا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ انجمن کی طرف سے ایک عرضداشت وزیر اعلیٰ مغربی بنگال کی خدمت میں پیش کی جائے جس میں یہ مطالبہ کیا جائے کہ اردو کو بھی مغربی بنگال میں بحیثیت ثانوی سرکاری زبان منظور کرنے کے لئے بل میں ترمیم کی جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ جناب سید بدرالدجیٰ صاحب کی سرکردگی میں ایک وفد وزیر اعلیٰ موصوف سے مل کر انجمن کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرے۔

اس جلسہ میں وزیر اعلیٰ کانفرنس کی اس تجویز پر بھی غور ہوا کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کا رسم الخط دیوناگری ہو۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل تجویز منظور ہوئی۔

انجمن ترقی اُردو مغربی بنگال کا یہ جلسہ وزرائے اعلیٰ کی گذشتہ کانفرنس میں منظور ہونے والی اس تجویز کو جس میں ہندوستان کی تمام زبانوں کے لئے دیوناگری رسم الخط کی سفارش کی گئی ہے ایک ناقابل عمل تجویز محسوس کرتے ہوئے تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس تجویز سے انتہائی بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔

اس جلسہ کی نظر میں یہ اور اس قسم کی تجاویز قومی اتحاد و استحکام کے منافی ہیں اور یہ جلسہ یقین رکھتا ہے کہ یہ اور اس قسم کی تجاویز قومی یکجہتی کو سخت نقصان پہنچانے کا باعث ہوں گی ساتھ ساتھ یہ جلسہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ یہ تجویز اور اس قسم کی دیگر تجاویز مختلف زبانوں کی لسانی بنیادوں کو ختم کرنے کا سبب بنیں گی۔ نیز یہ کہ ایسی تجاویز دستور ہند کے خلاف جاتی ہیں جس میں ہندوستان کی ۱۴ زبانوں کو مساوی درجہ دیا گیا ہے اور ہر زبان کے ساتھ اس کا رسم الخط بھی شامل ہے۔

(ایم۔ اے۔ مجید جنرل سکریٹری)

پٹنہ میں یوم جگر

بزم انجم رام موہن رائے کالج پٹنہ کے زیر اہتمام زیر صدارت جناب پروفیسر کملاپتی سنگھ شاندار طور پر یوم جگر منایا گیا۔ اس موقع پر کالج کے طلبہ و طالبات نے جگر سے متعلق مختلف مضامین اور نظمیں پڑھیں۔

اس کے بعد جناب ظفر سعید صاحب صدر نے ایک مقالہ "جگر بحیثیت وطن پرست" پڑھا۔ آخر میں صدر موصوف نے اپنے صدارتی خطبے میں جگر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ معتمد بزم کی رپورٹ اور شکریے کے بعد جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

(سید ابوالبرکات دسنوی)

بھوپال میں یوم جگر

بھوپال۔ ۱۱ر اکتوبر۔ یہاں ادبی انجمن "حلقۂ ارباب ادب" کے زیر اہتمام کیپٹل ہوٹل کے ہال میں یوم جگر منایا گیا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر مس شگفتہ فرحت نے کی۔

جلسے میں تقریر کرتے ہوئے جناب کوثر چاند پوری نے کہا کہ جگر ان شعراء میں سے تھے جنھوں نے غزل کی برتری کو منوایا اور اپنی غزلوں کے گداز سے ایک پورے دور پر اثر ڈالا۔ مس قمر النساء پرنسپل آزاد اُردو کالج نے کہا کہ جب تک اُردو غزل زندہ ہے جگر بھی زندہ رہیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہم جگر کی آواز الگ سے پہچان سکتے ہیں ان کا تغزل دل کا وہ نغمہ ہے جسے امر کہا جاسکتا ہے۔

جلسہ کا آغاز جگر کی ایک غزل سے ہوا جسے مسٹر مقصود انجم نے پڑھا مسٹر درگا پرشاد شاد سلطانپوری اور مسٹر عشرت قادری نے اپنی منظومات کے ذریعہ مرحوم شاعر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس جلسے میں بھوپال کے ادیب و شاعر، صحافی و طلبہ بڑی تعداد میں شریک تھے۔

(سکریٹری)

"امجد مطالعہ گھر"

بیرون دبیر پورہ مسجد پیر بادشاہ حیدرآباد میں "امجد اکیڈیمی" کے تحت قائم کیے گئے "امجد مطالعہ گھر" کا بیگم حضرت امجد نے خواتین کے بھاری اجتماع کے آگے افتتاح فرمایا۔

(محمد عمر یوسفی)

تمل ناڈ اُردو مجلس "شاخ" مدورا

۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کی شام کو زیر صدارت حضرت ایم۔ جے۔ محمد سعید صاحب پرنسپل جمال محمد کالج ترچناپلی جنوبی ہند کے قدیم شہر مدورا میں تمل ناڈ اُردو مجلس مدورا کی شاخ کا ایک خصوصی اجلاس پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب وزیر ہند کی موجودگی میں ہوا۔

پروفیسر صاحب نے جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ

مسلمانوں نے ہندوستان کی تہذیب و کلچر کو بہت کچھ نوازا جس میں اُردو زبان بھی شامل ہے۔

حضرت محمد سعید صاحب، پرنسپل جمال محمد کالج ترچناپلی صدر اجلاس نے مدراس کی اہمیت اور اس شہر سے اُردو کے تعلق سے متعلق بصیرت افروز تقریر کی۔

ڈاکٹر ٹی امیر الدین احمد صاحب صدر مرکزی مجلس نے مدراس کے اُردو داں احباب سے مجلس کے استحکام کے سلسلے میں پرجوش اپیل کی۔ انہوں نے کہا کہ اس کی حفاظت کے ساتھ ساتھ مادری زبان کا تحفظ بھی ادارہ کا فرض ہے۔

اسی شب میں حضرت سعید صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں مقامی شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ مشاعرہ شب کے ۱۲ بجے ختم ہوا۔ جلسے میں تقریباً ایک ہزار اردو داں شریک رہے۔ (سکریٹری)

فہرست رائے دہندگان اُردو میں بھی شائع کرنے کا مطالبہ

حیدرآباد، ۱۰ر اکتوبر۔ فہرست رائے دہندگان انگریزی اور تلگو کے ساتھ اُردو میں شائع نہ کرنے کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہوئے مسٹر مرزا جمیل احمد بیگ ایڈوکیٹ رکن بلدیہ نے کہا ہے کہ آندھرا پردیش بالخصوص حیدرآباد کے لاکھوں اُردو بولنے والوں کیلئے یہ بات افسوسناک بلکہ ایک صدمہ سے کم نہیں ہے۔ حکومت آندھرا پردیش کے تعلق سے یہ بات مشہور ہے کہ اس نے اُردو کے ساتھ مثالی پالیسی اختیار کی ہے۔ حیدرآباد کو اُردو کا مرکز کہا جاتا ہے۔ اس ریاست اور اس کے صدر مقام میں فہرست رائے دہندگان کا اُردو میں شائع نہ ہونا یقیناً شکوک و شبہات کو جنم دینے کا باعث بنے گا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پڑوسی ریاستوں میں جہاں بالعموم اُردو کے ساتھ انتہائی قابل اعتراض پالیسی اختیار کی جاتی ہے فہرست رائے دہندگان اُردو میں شائع کی جا رہی ہے۔ حکومت آندھرا پردیش واضح طور پر اعلان کر چکی ہے کہ جہاں بھی کسی لسانی اقلیت کی آبادی ۱۰ فیصد ہو سرکاری اعلانات وغیرہ اس لسانی اقلیت کی زبان میں بھی شائع کئے جائیں گے۔ امید ہے کہ الکشن کمیشن اس غلطی کی اصلاح کرے گا اور ریاستی حکومت بھی الکشن کمیشن کو اس جانب فوری توجہ دلائے گی۔

بقیہ

قول فیصل

مہاراجہ شاد کی ادبی تصنیفات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اشک صاحب دیکھیں گے کہ حضرت سرشار کے دکن میں وارد ہونے سے پہلے ۱۳۱۲ ہجری میں "مطلع خورشید" شائع ہو چکا تھا اور "بزم خیال" و "فسانہ شاد" سرشار کی وفات کے کئی سال بعد شائع ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ حضرت سرشار نے یہ ناول جنت سے لکھ کر مہاراجہ کے پاس ارسال کر دیئے ہوں گے۔ لیکن ان ناولوں کا رنگ تو اصلاحی ادب پریم چند مرحوم کے ناولوں کا سا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ نے ان دنوں منشی پریم چند مرحوم سے یہ ناول خرید کر اپنے نام سے شائع کرا دیے ہوں۔

قارئین ہماری زبان کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ ساری تحقیق و تنقید صرف اشک صاحب کی بدولت "نیک نام" ہو رہی ہے ورنہ دیگر ارباب سخن تو اسے "بدنام" کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ناظرین کو حیرت نہ ہونی چاہئے کہ اشک صاحب نے سرشار کی تصانیف پر ایک تحقیقی مقالہ ایم اے اُردو کے لئے سپرد قلم کیا تھا (بقول ڈاکٹر قمر رئیس) اور یہ اس خاص مقالے کے کچھ حصص تھے۔ اور مسرت کا مقام ہے کہ یہ مقالہ عنقریب کتاب کے روپ میں شائع ہونے والا ہے۔

اس سلسلے کی ایک کڑی ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کا مضمون بھی ہے جو ہماری زبان کی ۱۵ر مارچ ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں چھپ چکا ہے۔ ناول "چنچل نار" پر گرما گرم گفتگو کی سلسلہ جنبانی موصوف نے ہی کی تھی۔ شکر ہے کہ قمر صاحب نے یہ تو مان لیا ہے کہ چنچل نار مہاراجہ شاد کی مخلوق فکر ہی سے ہے۔ لیکن ان کے ذہن میں کچھ نئے شکوک نے جنم لے لیا ہے۔ ان شکوک کے ازالہ کے لئے موصوف نے جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی سے رجوع کیا ہے۔ لیکن خادم ان سے اجازت مانگتے ہوئے کچھ عرض کرتا ہے۔ شاید راقم سے ہی ان کے نئے شکوک کا ازالہ ہو جائے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ "مہاراجہ شاد کے ناول "چنچل نار" میں سرشار کا فن کیوں نمایاں ہے۔ اگر اسے صرف اصلاح کا کرشمہ سمجھا جائے تو سوال ہو گا کہ صرف زبان و بیان کی اصلاح یا پورے ناول کی۔ اگر اصلاح کو پورے ناول پر پھیلا کر جائزہ لیا جائے تو آخر میں نتیجے کے طور پر یہ بتانا ہو گا کہ یہ مصلح کا حصہ ہے اور یہ مصنف کا۔"

راقم اپنے پہلے مضمون میں عرض کر چکا ہے کہ اردو ادب میں استادی شاگردی کی روایت ایک نہایت استوار روایت ہے۔ اس سلسلے میں دیگر امور کی بھی وضاحت کر چکا ہے جن کا اعادہ غیر ضروری اور بے محل ہے۔ ہاں تلامذہ کے کلام و تصانیف میں اساتذہ کی اصلاح کے حصص کو علیحدہ کرنا میرے تو کیا کسی کے بھی بس کی بات نہیں۔ موصوف نے اگر اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے تو ڈاکٹر صاحب کا یہ مجتہدانہ اقدام واقعی مستحسن اور قابل داد ہے۔ امید ہے کہ موصوف نے مولانا حالی کی تخلیقات میں غالب کی اصلاح کا حصہ، شاہ ظفر مرحوم کے کلام میں استاد ذوق کا حصہ، شیفتہ مرحوم کے کلام میں حکیم مومن خاں مومن کی اصلاح کا حصہ، اور حسرت موہانی مغفور کے کلام میں تسلیم دہلوی کی اصلاح کا حصہ علیحدہ کر چکے ہوں گے۔ نیز دیگر شعرائے کرام کے کلام پر بھی اس نوع کا تحقیقی کام کر رہے ہوں گے۔ یقین واثق ہے کہ مستقبل قریب میں ان کی تحقیقات کے رنگا رنگ شگوفوں سے گلستان اُردو کا دامن مالا مال ہو جائے گا۔

بھارت میں اُردو صحافت کی تاریخ و ترقی

ایک مختصر جائزہ (حصّہ دوم)

۱۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء سے وگیان بھون میں بھارت کے اُردو اخباروں اور کتابوں کی ایک نمائش منعقد کی گئی ہے جس کا افتتاح پردھان منتری نے کیا۔ اس موقع پر ذیل کا مضمون قارئین کے لئے باعث دلچسپی ہوگا۔ اس میں اُردو صحافت کے آغاز و ارتقاء پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

(پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا)

اُردو اخبار نویسی کی نشو و نما کی کہانی بڑی طویل اور دلچسپ ہے۔ سنہ ۱۸۲۲ء میں صرف ایک اُردو اخبار کلکتہ سے شائع ہوتا تھا اور سنہ ۱۹۲۰ء میں اُردو اخبارات اور رسائل کی تعداد ۳۳۷ تھی۔ یہ ایک قابل ذکر کامیابی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سنہ ۱۸۲۲ء میں "جام جہاں نما" کی اشاعت کے ایک سال بعد اُردو اور فارسی دو زبانوں میں شائع ہونے والا ایک اور ہفتہ وار اخبار "شمس الاخبار" شائع ہونا شروع ہوا۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں فارسی کے بجائے اُردو عدالتی زبان بنی اور اس کے بعد جلد ہی دہلی میں لیتھو گرافی پرنٹنگ کا آغاز ہوا۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں "دہلی اخبار" اُردو جسے "دہلی اُردو اخبار" بھی کہا جاتا تھا کے مقبول عام ہونے پر باقاعدگی سے خالص اُردو اخبار نویسی کا دور شروع ہوا۔ اس اخبار کے کالموں میں ادبی سرگرمیوں اور مغل دربار کی جس کا اثر و رسوخ اس وقت تک لال قلعے کی چار دیواری تک محدود ہو چکا تھا سرگرمیوں کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کیا جاتا تھا۔

یہ اخبار سنہ ۱۸۵۷ء تک چھپتا رہا۔ تیسرا باقاعدہ اُردو اخبار "سید الاخبار" بھی دہلی سے سنہ ۱۸۳۷ء میں چھپنا شروع ہوا لیکن اس کی اشاعت کا سلسلہ سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد جاری نہ رہ سکا۔ ایک اور اُردو اخبار "جامع الاخبار" سنہ ۱۸۳۹ء میں مدراس سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس میں عام طور پر مقامی خبریں اور سرکاری اعلانات شائع ہوتے تھے۔ یہ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا اور اس کے صفحے کے دو کالم ہوتے تھے۔ "نور مشرق" کی اشاعت دہلی سے سنہ ۱۸۳۳ء میں شروع ہوئی۔ اس میں درباری سازشوں کی پوری تفصیلات شائع ہوتی تھیں اور غیر ملکی خبر، سیاسی اور بین الاقوامی خبروں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کا ماہانہ چندہ صرف چار آنے تھا اور اس میں چھپنے والے اشتہارات کا نرخ ایک آنہ فی سطر تھا۔ سنہ ۱۸۴۶ء میں بھی چند اہم اُردو اخبارات "فوائد الناظرین" جسے سینٹ سٹیفنس کالج کے پروفیسر رام چندر چلا رہے تھے۔ اور ایک ہفتہ وار باتصویر اخبار "قران السعدین" جسے پنڈت دھرم نارائن چلا رہے تھے شائع ہونے شروع ہوئے۔ "فوائد الناظرین" میں تصویروں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے خاکے پہلی بار شائع ہوئے۔ یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ تھا۔ پروفیسر رام چندر نے "محب ہند" نامی ایک اخبار بھی نکالا جو کئی سال جاری رہا۔ پنڈت دھرم نارائن کا اخبار برطانیہ نواز تھا اور اس کا مدعا ہندوستانیوں میں سائنسی اور مغربی طور طریقوں کو مقبول بنانا تھا۔ یہ بارہ سال تک چھپتا رہا۔ سنہ ۱۸۴۷ء میں آگرہ سے ہفتہ وار "اسعد الاخبار" شائع ہونا شروع ہوا۔ اور سنہ ۱۸۵۱ء تک چھپتا رہا۔ سنہ ۱۸۴۸ء میں مدراس سے ہفتہ وار "اعظم الاخبار" شائع ہونا شروع ہوا جس میں مقامی اور غیر مقامی دونوں قسم کی خبریں شائع کی جاتی تھیں۔

سنہ ۱۸۴۹ء میں اُردو اور مراٹھی دونوں زبانوں میں ایک مقبول عام اخبار "مالوہ اخبار" کی اشاعت شروع ہوئی۔ مرزاپور کا "خیر خواہ ہند" (سنہ ۱۸۳۷ء) دہلی کا "دار الاسلام" (۱۸۴۹ء) اور "گلزار بہشت، بہار" اس زمانہ کے کچھ دوسرے قابل ذکر اخبارات ہیں۔

اُردو اخبار نویسی کا دوسرا دور

سنہ ۱۸۵۷ء تک اُردو اخبار نویسی کی نشو و نما کا پہلا دور مکمل ہوا۔ اس زمانے میں زیادہ تر اخبارات ہفتہ وار تھے اور لیتھو کے ذریعے چھپتے تھے اور ان میں زبان، طرز تحریر اور موضوعات کے بارے میں کسی مستقل پالیسی پر عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو ڈاک کے سسٹم اور ریل گاڑیوں کی عدم موجودگی کے باعث خبریں اکٹھا کرنے اور انھیں بھیجنے کے ذرائع بہت محدود تھے۔ شروع کے اُردو رسائل کے صفحات غزلوں سے بھرے ہوتے تھے اور یہ مکمل طور پر ادیبوں کے ہاتھوں میں تھے۔ اُردو اخبار نویسی کے دوسرے دور میں باقی ماندہ انیسویں صدی کے اخبار آتے ہیں اور اسے اردو اخبار نویسی کا سنہری زمانہ کہا جاتا ہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اخبارات کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ لیکن اُردو اخبارات سیاسی مسائل پر بحث کرنے میں نسبتاً محتاط تھے۔ تعلیمی و تاریخی مسائل سے متعلق واقفیت اور سائنسی معلومات کی مانگ اس دور میں بڑھ گئی اور لوگوں نے مغربی علوم میں دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ سیاسی فضا میں تبدیلی کا اثر زبان پر بھی پڑا اور اب اخبارات میں عام فہم زبان استعمال ہونے لگی۔ "اودھ اخبار" (لکھنؤ)، "سائنٹفک سوسائٹی میگزین" اور سر سید احمد خاں کے "تہذیب الاخلاق" (علی گڑھ) نے اخبار بین متوسط طبقے کے ذوق میں ایک نئی تبدیلی پیدا کی۔ ان دنوں زیادہ تر اخبار لاہور، دہلی، لکھنؤ، آگرہ، علی گڑھ اور میرٹھ سے شائع ہوتے تھے۔ (باقی)

تبصرہ

خلیل الرحمٰن اعظمی

تذکرے اور تبصرے:

مصنف: جلیل قدوائی

ناشر: اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی

قیمت: دو روپے چار آنے

جلیل قدوائی اردو کے ان ادیبوں میں ہیں جنھوں نے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان اپنی افسانہ نگاری، شاعری، تنقید، تراجم اور تالیفات کی بدولت اردو داں حلقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ شاعری میں وہ حسرت موہانی کے متبعین میں ہیں۔ ان کی غزل اپنی لطافتوں کے باوجود دورِ جدید کے مطالبوں کا ساتھ نہ دے سکی کیونکہ اس میں اجتماعی زندگی کا شعور اور وہ نفسیاتی تہیں نہیں ہیں جو ۱۹۳۵ء کے بعد نہ صرف اردو نظم میں بلکہ اردو غزل میں بھی ایک نئے ذہن کی علامت سمجھی جانے لگیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آنے والی نسلوں نے انھیں بحیثیت شاعر نظر انداز کر دیا۔ اسی طرح انکی افسانہ نگاری بھی ایک عبوری دور کی چیز ہو کر رہ گئی۔ ابتدا میں انھوں نے موپاساں اور چیخوف وغیرہ کے افسانوں کو اردو کا لباس پہنایا اور اردو کے افسانے کو نئے مزاج سے آشنا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے لیکن خود ان کے طبعزاد افسانوں کا مواد بہت جلد ختم ہو گیا۔ اور وہ بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ نہ دے سکے۔ البتہ ان کے مضامین اور تبصروں کا سلسلہ کسی نہ کسی طور پر جاری رہا اور مختلف نوعیت کے انتخابات بھی وہ اپنے تنقیدی مقالوں کے ساتھ شائع کرتے رہے۔ کچھ دن پہلے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "تنقیدیں اور خاکے" شائع ہوا تھا۔ اس میں بعض مضامین بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں، بالخصوص شاد عظیم آبادی پر۔ زیرِ نظر مجموعے میں ان کے پرانے مضامین ہیں۔ یہ مضامین زیادہ تر تعارفی ہیں اور ان کا مقصد اپنے موضوع سے قارئین کو پورے طور پر باخبر کرنا اور انھیں شاعر یا مصنف سے زیادہ سے زیادہ قریب کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدوائی صاحب نے یہ کام بڑے سلیقے سے کیا ہے اور مذاقِ سلیم کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ان کا اسلوبِ تحریر شگفتہ اور دلنشین ہے۔ ایسی نثر عام طور پر عہدِ حاضر کے ناقدوں کے یہاں نہیں ملتی۔ اس مجموعے کا سب سے اچھا مضمون "بیدار" پر ہے۔ "منتخبات مشتاق"، "حسرت موہانی کی شاعری"، "غزلیاتِ مومن"، "غزلیاتِ حالی" اور "حکمتِ مومن ال رواں" یہ بھی قابلِ قدر مضامین ہیں۔ آخر میں کچھ تبصرے بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ یہ وہ تبصرے ہیں جو "تازہ مطبوعات" کے ذیل میں رسالہ اردو میں شائع ہوا کرتے تھے۔ مجاز کے مجموعۂ کلام "آہنگ" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا تو قدوائی صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:-

"اسرار الحق مجاز اردو کے ہونہار شعراء میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں نوجوانی کا جوش اور تخیل کا بانکپن پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں ندرت اور رنگینی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ان کے موجودہ رنگِ سخن سے ایکے مستقبل کے متعلق خوشگوار پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔"

لیکن اس مجموعے پر سجاد ظہیر نے جو دیباچہ لکھا تھا اس پر قدوائی صاحب نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا تھا۔ لکھتے ہیں:-

"مجموعے کی ابتدا میں 'زیبِ داستاں' کے عنوان سے جناب سجاد ظہیر نے مجاز کا تعارف کرایا ہے۔ آپ کے خیال میں "جو شخص ان نظموں اور غزلوں کو پڑھے گا وہ یہ محسوس کرے گا کہ تہذیب تمدن کی دلہن کا لباس اب ریشمی نہیں وہ چیتھڑے پہنے ہوئے ہے۔ وہ قصرِ امراء کی آرام دہ غلامی سے پیچھا چھڑا کر سیلابِ حیات کے منجدھار میں بڑھنا زیادہ پسند کرنے لگی ہے۔" مگر اس مجموعے میں بہت سی نظمیں اس کلیہ کے خلاف پیش کی جا سکتی ہیں اس لئے مجاز کی شاعری کے متعلق یہ حکم لگانا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں "ادب اور زندگی" کے تعلق پر زور دے کر ہمارے شعراء کو ملک کی موجودہ سماجی اور سیاسی جدوجہد سے متاثر ہو کر ادب میں انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت پر جو توجہ دلائی گئی ہے۔ ہمیں اس سے پورا اتفاق ہے مگر یہ مسئلہ ہمارے نوجوان شعراء نے غالباً ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا ہے۔ ادب میں انقلاب کے معنی ادب میں انتشار، بدنظمی اور سوقیانہ پن پیدا کرنے اور حسنِ ادب کو بے لگام چھوڑ دینے کے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے کچھ دنوں سے ہمارے ادب میں جو رسمی اور نام نہاد انقلابی شاعری شروع ہوئی ہے وہ بے اثر بلکہ مضر ثابت ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان شعراء تخریبی سے زیادہ تعمیری نقطۂ نظر سے کام لیں۔ سرمایہ دار اور مزدور کے عنوانات پر رسمی نظمیں لکھنے کے بجائے زندگی اور سماج کے مسائل پر زیادہ گہری اور سنجیدہ نظر ڈالیں۔ زندگی میں ان انسانی اوصاف اور خصائل کو راہ دینے کا پرچار کریں جنھوں نے ہر زمانہ میں قومی زندگی کی تعمیر اور ترقی میں بیش از بیش حصہ لیا ہے۔"

قدوائی صاحب کے اس تبصرے سے ان کی بالغ نظری اور سلجھے ہوئے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ جس وقت "آہنگ" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا ہے اس وقت عام طور پر دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو ہر نئے اور ترقی پسند شاعر کو گردن زدنی سمجھتا تھا اور دوسرا گروہ وہ تھا جو تمام رطب و یابس کی مکمل مدافعت کرتا تھا اور اس کے خلاف ایک فقرہ بھی سننے کیلئے آمادہ نہیں تھا۔ یہ تبصرہ توازن کی بڑی اچھی مثال ہے۔ غالباً اپنی اسی افتادِ طبع کی بنا پر ہی اپنے اس مجموعۂ مضامین کو جلیل قدوائی نے آل احمد سرور کے نام معنون کیا ہے۔

سلطان احمد ناظم اُردو لائبریری پٹنہ

ہمارے کتب خانے

ہلکی پھلکی اور آسانی سے ہاتھ آنے والی کتابوں کا یہ کرشمہ کتنا عجیب اور کس قدر عظیم الشان ہے کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی مضبوط و مستحکم سنگین اور آہنی یادگاروں کے مٹنے اور برباد ہو جانے پر ان کا نشان و پتہ بتاتی ہیں اور ان کے آثار و ماحول کو ہمارے دلوں پر مسلط کرتی ہیں۔ آج ابن آدم اگر طوفان نوحؑ کے حوادث معلوم کرنا چاہے اور ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام جس اعلان حق کی خاطر جلاوطن ہوئے یا فراعنۂ مصر کے ہاتھوں بنی اسرائیل کو جن شدتوں سے گزرنا پڑا، ان کے گرد و پیش حالات کی تلاش ہو۔ تو اس قلمبند سرمایہ کے سوا ہمارے پاس اب کیا رہ گیا ہے؟ جس سے اگلوں کا حال معلوم ہو اور ہم اقوام سابقہ کے عروج و زوال اور ان کی تہذیب و معاشرت سے آگاہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کا آسان ذریعہ، یہی کتابیں ہیں، جو ایک نظر میں ہمیں یہ بتا سکتی ہیں کہ افلاطون کی جمہوریت اور سولن کا قانون کیا ہے۔ منو سمرتی کا سماج کیونکر بنا اور سشیخ کا مزاج طبیعتوں کا کس درجہ متحمل ہے یا پھر مصر کی قدامت، ہند کی عظمت، روما کی شوکت اور عربوں کی خلافت کیا حیثیت رکھتی ہیں اور انکی تابانیوں سے زمانہ کا چہرہ کتنا روشن ہوا؟ ہم آج بھی ڈیموس تھینز اور سسرو کی پکاریں سنتے ہیں، سیزر کا حوصلہ اور اسکندر کے عزائم دیکھتے ہیں۔ چنکیا کی راج نیتی ہمارے سامنے ہے اور شیر شاہ کا نظم و نسق اور اس کے رفاہ عام کے کارنامے ہماری نظروں سے اوجھل نہیں۔ اس کے دل میں خدمت خلق کی جو لگن تھی اور صرف پنجسالہ مدت میں ان کے تکمیل کی جو صورتیں بروئے کار ہوئیں۔ ان سے ہم آج بھی پورا پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں!

آزادی کے بعد ہمارے کتب خانے اب بڑھتے اور پھیلتے جاتے ہیں۔ وہ اپنی تعداد اور استعداد دونوں لحاظ سے ترقی کر رہے ہیں عوام کی نظروں میں بھی ان کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے ....
کہ پرانے ذخیرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے گئے اور ان کو نئے طریقوں پہ مرتب اور مزین کیا گیا۔ گھروں اور خانقاہوں میں یہ قومی سرمایہ، جس طرح بند ہو کر برباد ہو رہا تھا، اس کی جگہ اب ذاتی توجہ اور اداراتی تنظیم، ان کے مفید اور کار آمد بنانے میں کوشاں ہیں تاکہ ان کے مطالعہ، حوالہ اور تحقیقات کی گنجائشیں نکلیں اور ان سے کماحقہ فائدہ اٹھایا جائے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو کتب خانوں کی سب سے بڑی اہمیت یہ نہیں ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ کتابیں موجود ہوں۔ بلاشبہ کتابوں کی بڑی تعداد ہونا بھی ایک بڑی خصوصیت ہے مگر یہی سب کچھ نہیں۔ بلکہ اصلی چیز، جو کسی کتب خانے کے لئے قابل فخر ہو سکتی ہے۔ وہ کتابوں کا زیادہ سے زیادہ مصرف لینا ہے۔ اور یہ بھی مطالعہ کی ایک عوامی صورت ہوئی جو محض خوش وقتی کی دلیل ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک جو چیز خاص توجہ کی مستحق ہے۔ وہ حقیقت میں کار آمد مطالعے کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ اور جو کتب خانہ اس ضرورت کو بدرجۂ اتم پورا کرے اور جہاں ایسے قارئین کی تعداد بڑی سے بڑی ہو۔ در اصل وہی کتب خانہ اپنے قیام کا پورا حقدار ہے اور وہی اپنے قابل فخر ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔ اسی قدر نہیں، بلکہ ہمیں کہنا چاہئے کہ ان ضرورتوں کا پورا کرنا تو الگ رہا۔ ان کتب خانوں کے قیام کی غرض و غایت ہی یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس احساس کو بیدار کریں اور صرف ضرورتوں کو پورا کرنا کافی نہ سمجھیں بلکہ ان خصوصیتوں کی طرف عوام کو متوجہ اور خواص کو رجوع رکھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بڑے دیکھ بھال اور طویل پروگرام کی حاجت نہیں رکھتا اور متعلق اور ادارے بطور خود اس کو بآسانی انجام دے سکتے ہیں اپنے حلقوں میں وہ ندرت اور جاذبیت پیدا کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کو آسان کر دے۔ کیونکہ کتب خانوں کی پُر سکون فضاؤں میں کوئی ہنگامی شکل گوارا نہیں ہو سکتی اور کامیاب مطالعہ، بلا آواز ہونا ضروری ہے، ایک ایسا منظر، جو کسی بڑی تعداد کو خاموشی کے ساتھ غرق مطالعہ دکھائے۔ بطور خود مطالعہ کا مائل کر دیتا ہے۔ اسی لئے کتب خانوں میں نعمانی اور ریڈیائی اضافے اور ان کی توسیع پسندیدہ اور مستحسن نہیں۔ خصوصاً جب کہ ان کا موقع اور محل بھی مشترک ہو۔ ایک ذاتی مشاہدہ ملاحظہ فرمائیں:۔

ایوان پرسکون تھا، اور مطالعہ شباب پر۔ یکایک دیکھتے ہیں کہ قارئین میں دو نو عمر، اپنے مطالعہ کی ہیجانی کیفیت سے متاثر ہو کر باہمی گفت و شنید میں مشغول ہیں، اور ایوان کا شاہانہ سکون ان کے ہونٹوں کی گرجدار آوازوں سے پامال ہو رہا ہے۔ وہ دوسروں سے بے پروا ہوں مگر دوسرے ان سے غافل نہ تھے۔ ناچار ہمیں مداخلت کرنی پڑی۔ مگر صورت کیا تھی؟ جو فعل اپنے لئے پسندیدہ نہ ہو وہ دوسروں کے لئے روا رکھنا یا جس بات کو روکنا منظور تھا اس کو خود ہی کرنا مناسب نہ تھا۔ بولنے میں گفتگو کے جاری رہنے کا اندیشہ اور اس کے بڑھنے کا خطرہ بھی تھا۔ اس موقع پہ ذہن نے یاوری کی اور ایک ننھے سے پرزہ پر یہ عبارت لکھی:۔

کلب اور کتب خانہ کا فرق؟
کلب = گفت و شنید
کتب خانہ = خاموش مطالعہ

اور چپکے سے ان کے درمیان رکھ دی۔ اب دونوں چہرے جو

دعصابی کشش سے تمتائے ہوئے تھے۔ ان الفاظ پر نظر پڑتے ہی مسکرائے۔ وہ کچھ بولے نہیں اور مطالعہ میں لگ گئے۔ میں نے بھی اس وقتی سوجھ کو غنیمت سمجھا اور لوٹ آیا۔ کتب خانے کی مشغولیتوں میں ایک نازک مرحلہ، کتب خانہ بند کرتے وقت پیش آتا ہے۔ یہ وقت بڑے اضطراب کا ہوتا ہے۔ مجلسوں کا منتشر ہونا اور محفلوں کا اکھڑنا یوں بھی بار خاطر ہے۔ کسی جلسۂ جلوس کی آمد و شرکت اس کے نظم و ترتیب کی اس قدر قابل توجہ نہیں جس قدر ان کے انتشار، برہمی اور برخاستگی کا عالم نفسیات اجتماع کا محتاج ہے۔ چونکہ انتشار، اجتماع کی ضد ہے اس لئے اس کی ہلکی اور آنی ساعت بھی گراں گزرتی ہے۔ اور جب منتشر ہونے کی یہ صورت، اجتماعی اور یک ساعت وارد ہو تو اس کی شدت بہت تیز و تند ہوتی ہے اور شرکاء اور منتظمین دونوں کے لئے صبر آزما بن جاتی ہے۔ جس کام میں دل لگ جائے، اس کا وقفہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ اس کو پورا ہی کرکے اٹھئے۔ مگر ہر کام کا قاعدہ قانون ہے، اور ضابطہ کی پابندی ضروری ہے۔ یہاں بھی مقرر اور ساعتیں گنی ہوئی ہیں۔ ان کا وقت کے مطابق ہونا ان کے پورے ہونے کی دلیل ہے۔ وقت پہ اختتام دینے کے معنی ہیں کہ ان کی ابتدا بھی ٹھیک ہوگی۔ کیونکہ جس طرح ابتدا، انجام کی خوش خبری ہے اسی طرح انجام کی شادکامی مستقبل کے شاندار ہونے کی ضمانت ہے!

ذاتی خواہشات سے قطع نظر، مجموعی طور پر فائدہ اسی میں ہے کہ مقررہ معمولوں پر عمل در آمد کیا جائے۔ کاموں کے بحسن و خوبی انجام دینے کا یہی طریقہ بہتر ہے۔ لیکن صورت حال کی تبدیلی کتنی ہی خوش آیند ہو اکثر طبیعتوں پر بوجھل ہوتی ہے مگر قبول کئے بغیر چارہ نہیں۔ اب دیکھئے تو یہ حالت کھوئے ہوؤں میں شمار کرتی ہے۔ کوئی اپنے ناتمام مطالعہ پر کھسیانا نظر آتا ہے۔ کسی کے قدم میں جنبش تیز اور کوئی چلتے ہوئے بھی رکتا جاتا ہے۔ بعض اٹھتے وقت کتابوں کو زور سے پٹک دیتے ہیں۔ کتنے ایسے بھی ہیں جو کتاب چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ غرض روانگی کا یہ وقت بڑی توجہ کا طالب ہے۔ اس موقع پر مزید نگرانی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام طور پہ اندراج مطالعہ ضروری نہیں سمجھا جاتا اور دستخط کرنے سے پرہیز یا تساہل کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ مطالعہ کو مستند اور خود اعتمادی کو متحرک کرتا ہے۔ مگر جب اٹھنے پر آتے ہیں تو اس تیزی سے نکلتے ہیں کہ سنبھالے نہ جائیں تو ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور نقصان اٹھائیں۔ اسی عجلت کی حالت میں ایک دن یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک صاحب نے اپنا دستخط اس زوروں پر کھینچا کہ قلم نے دم توڑ دیا اور صفحہ پاش پاش ہوگیا۔ غصہ مفید نہ تھا، مگر دبانا ضروری۔ مجھے اس غصہ کو دبانے اور کارآمد بنانے کے لئے قصور کو اپنی ہی جانب منتقل کرنا پڑا۔ میں نے دبی زبان سے کہا "شاید نب کی خرابی ہے، بدل دی جائے گی آپ معاف فرمائیں۔" اس معاذرت مجہول کا اثر کیا ہوا؟ آپ جانتے ہیں، وہ نادم ہوئے اور ہمارے معاون بن گئے۔

بہرحال یہ تو روزمرہ کے نظم و نسق کی باتیں ہیں۔ جن سے کتب خانوں کے علاوہ آمد کی صورتیں واضح ہوتی ہیں۔ لیکن کتب خانوں کے اہم مقاصد کی اصلاح و ترقی ہماری خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اس باب میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کیا پڑھائیں اور مطالعہ کا عام لٹریچر کیا ہو؟ کیونکہ ہر قسم کی کتاب کا پڑھنا گویا جنگل کے خود رو درختوں کی سیر کرنا ہے۔ وقت کی تنگیوں اور ضرورتوں کی اہمیتوں کے پیش نظر، ایک مجموعۂ پریشاں میں کھوئے رہنا یا محض وقت کا کاٹ لینا نہ تو کسی ذوق سلیم کو گوارا ہوسکتا ہے اور نہ کسی تنظیم کے شایان شان ہے۔ اس کی ذمہ داری مطالعہ کرنے والوں سے زیادہ مطالعہ کرانے والوں پہ عائد ہوتی ہے کہ وہ عام طالبہ کی ضرورتوں کا اتنا آراستہ سامان مہیا کردیں کہ ان کے پڑھنے والے کم سے کم وقت میں اپنے مفاد کا مطلوبہ لٹریچر حاصل کرلیں اور ایک مکمل مطالعہ سے شادکام ہوں، کیونکہ علم و حکمت کا ایک قابل اعتماد مطالعہ صرف اسی طرح عام کیا جاسکتا ہے!

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شایع کیا